اختلاف رحمت ہے

فرقہ بندی حرام

مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب مدظلہم

ادارۃ المعارف کراچی ۱۴

اختلاف رحمت ہے
فرقہ بندی حرام

مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب مدظلہ

ادارۃ المعارف کراچی

باہتمام : محمد مشتاق سنی
طبع جدید : ذوالحجہ ۱۴۲۶ھ - جنوری ۲۰۰۶ء
مطبع : زمزم پرنٹنگ پریس کراچی
ناشر : اِدَارَۃُ المَعَارِف کراچی ۱۴
فون : 5049733 - 5032020
ای میل : i_maarif@cyber.net.pk

ملنے کے پتے:

* اِدَارَۃُ المَعَارِف کراچی ۱۴
فون: 5049733 - 5032020
* مکتبہ معارف القرآن کراچی ۱۴
فون: 5031565 - 5031566

عرضِ ناشر

مفتیٔ اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب دامت برکاتہم صدر جامعہ دارالعلوم کراچی، گزشتہ سال عمرے کی غرض سے سعودی عرب تشریف لے گئے تھے، اسی سفر کے دوران ۱۳؍جمادی الاولیٰ ۱۴۲۵ھ مطابق یکم جولائی ۲۰۰۴ء کو جدہ میں جناب بہجت ایوب زنجانی صاحب کے مکان پر دانشوروں کے ایک منتخب اجتماع سے آپ نے ایک وقیع خطاب کیا تھا۔ "اِدَارَۃُ الْمَعَارِف کَرَاچی" کو اسے افادۂ عام کی غرض سے کتابچہ کی شکل میں شائع کر کے پیش کرنے کی سعادت حاصل ہوئی ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنی بارگاہ میں شرفِ قبولیت عطا فرمائے اور قارئین کے لئے اس کتابچہ کو حقیقی معنی میں مفید بنائے، آمین۔

طالبِ دُعا
محمد مشتاق تنتی
اِدَارَۃُ الْمَعَارِف کَرَاچی

ذوالحجہ ۱۴۲۶ھ
مطابق جنوری ۲۰۰۶ء

فہرستِ مضامین

❊❊❊

نَحْمَدُهٗ وَنُصَلِّیْ عَلٰی رَسُوْلِهِ الْكَرِیْمِ، أَمَّا بَعْدُ:
فَأَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّیْطَانِ الرَّجِیْمِ
بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ
يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ. وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖۤ اِخْوَانًا، وَكُنْتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا، كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ.

(آل عمران:۱۰۲،۱۰۳)

تمہیدی کلمات

بزرگانِ محترم اور برادرانِ عزیز!

میں سب سے پہلے برادرِ عزیز جناب بہجت صاحب کا شکرگزار ہوں کہ انہوں نے یہ موقع فراہم کیا، اور آپ حضرات کا ممنون ہوں کہ آپ نے اپنا قیمتی وقت نکال کر اِس ناچیز کو یہ سعادت بخشی کہ آپ حضرات کے سامنے اپنی معروضات پیش کرسکوں۔ اللہ تعالیٰ آپ حضرات کو اِس محبت کی جزائے خیر دے، آمین۔

جملۂ معترضہ کے طور پر یہ بات عرض کردوں کہ آپ حضرات کو شاید تعجب ہو رہا ہو کہ میں نے اِحرام کے کپڑے پہنے ہوئے ہیں لیکن ساتھ ساتھ میرے سر پر ٹوپی اور پاؤں میں موزے بھی ہیں۔ بات یہ ہے کہ میں نے ابھی تک اپنا اِحرام شروع نہیں کیا۔ آپ حضرات کو معلوم ہے کہ اِحرام ان کپڑوں سے شروع نہیں ہوتا بلکہ جب تلبیہ نیت کے ساتھ پڑھ لیا جائے، اس وقت سے اِحرام شروع ہوتا ہے، تو جب یہاں سے روانگی کا وقت ہوگا، اِن شاء اللہ میں اس وقت اِحرام شروع کروں گا۔

آیاتِ خطبہ کا ترجمہ

محترم بہجت صاحب نے مجھ سے یہ فرمایا تھا کہ اگرچہ یہ اجتماع بہت مختصر ہوگا لیکن اس میں مختلف تنظیموں اور مسالک سے تعلق رکھنے والے احباب موجود ہوں گے تو کوئی ایسی بات ہونی چاہیے جو ہم سب کے کام کی ہو۔ اسی وجہ سے میں نے قرآن مجید کی ان آیات کا انتخاب کیا جو آپ کے سامنے میں نے پڑھی ہیں، ان کا ترجمہ یہ ہے:-

ترجمہ:- اے ایمان والو! اللہ سے ڈرتے رہو جیسا کہ اس سے ڈرنے کا حق ہے، اور تمہیں موت نہ آئے مگر اس حالت میں کہ تم مسلمان ہو۔ اور تم مضبوطی سے پکڑے رکھو اللہ کی رَسّی کو اور آپس میں پھوٹ نہ ڈالو۔ اور یاد کرو اللہ تعالیٰ کی اس نعمت کو کہ جب تم آپس میں ایک دُوسرے

کے دُشمن تھے پھر اللہ تعالیٰ نے تمہارے دِلوں میں اُلفت
پیدا کی اور تم اس کے فضل سے بھائی بھائی ہو گئے۔

یہودی سازشوں کے مقابلے کا طریقہ

"اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَأَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ" کے اندر اشارہ ہے اوس و خزرج کے اختلافات کی طرف۔ یہ دونوں مدینہ طیبہ کے مشہور عرب قبیلے تھے، برسہا برس سے ان کے درمیان قتل و غارت گری کا سلسلہ جاری تھا۔ اور یہودی جو مدینہ طیبہ کے گرد و نواح میں مقیم تھے، وہ اِن دُشمنیوں کو ہوا دیتے تھے اور اِن اختلافات اور لڑائی جھگڑوں سے ہی ان کی چاندی ہوتی تھی، کیونکہ اس سے ان کا اسلحہ فروخت ہوتا تھا جس سے وہ خوب مال کماتے تھے اور لڑنے والے دونوں فریق ان سے قرضے لیتے تھے جس پر اِن کو سود ملتا تھا۔

یہودی، لڑائیوں کو ہوا دینے کے لئے کیا کیا سازشیں کرتے تھے؟ وہ ایک طویل داستان ہے، اور وہ داستان تقریباً ایسی ہی ہے جیسی آج کل مسلمانوں کو لڑانے کے لئے دُہرائی جارہی ہے۔ اِن آیات میں اِن سازشوں کا مقابلہ کرنے کا ایک طریقہ بتلایا گیا ہے۔ اور وہ ہے تقویٰ کو اختیار کرنا اور آپس میں اتحاد و اتفاق سے رہنا۔

چنانچہ سب سے پہلے یہ حکم دیا گیا کہ: "يَـٰٓأَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ"، "اے ایمان والو! اللہ سے ڈرتے رہو" اللہ سے ڈرنے کا مطلب یہ

ہے کہ اپنے آپ کو ہر قسم کے گناہوں سے بچاؤ، چھوٹے گناہوں سے بھی بچاؤ اور بڑے گناہوں سے بھی بچاؤ، کھلے ہوئے گناہوں سے بچاؤ اور چھپے ہوئے گناہوں سے بھی، حقوق اللہ سے متعلق گناہوں سے بھی بچاؤ اور حقوق العباد سے متعلق گناہوں سے بھی، ظاہری اعضاء کے گناہوں سے بھی بچاؤ اور دِل کے گناہوں سے بھی بچاؤ۔

قرآن مجید کا ایک خاص اُسلوب

قرآن مجید کا ایک اُسلوب ہے کہ وہ جب کوئی حکم دیتا ہے اور اس میں بظاہر بندوں کے لئے کچھ مشکل ہوتی ہے تو اس مشکل کو حل کرنے کا طریقہ بھی بتلاتا ہے۔ چنانچہ یہاں ''تقویٰ'' کا حکم دیا گیا جو اتنا آسان کام نہیں، زبان، کان، دِل، ہاتھ اور پاؤں کو ہر قسم کے گناہوں سے بچانا ایک مشکل کام ہے۔ اس مشکل کو آسان کرنے کا ایک طریقہ تو سورۂ توبہ میں اس طرح ارشاد فرمایا گیا:-

يَـٰٓأَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَكُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ.

ترجمہ:- اے ایمان والو! ڈرتے رہو اللہ سے، اور صادقین کے ساتھ رہو۔

''الصادقین'' سے مراد وہ لوگ ہیں کہ جو زبان کے بھی سچے ہیں اور دِل کے بھی، عقیدے کے بھی سچے ہیں اور عمل کے بھی یعنی اللہ والے۔

گویا یہ بتلادیا کہ جب اللہ والوں کے ساتھ رہو گے تو تقویٰ حاصل

کرنا آسان ہوجائے گا۔ اور ہمارا تجربہ بھی یہی ہے کہ اللہ والوں کے ساتھ رہنے سے گناہوں سے بچنا آسان ہوجاتا ہے، مثلاً اگر ہم سفر میں جائیں، دس پندرہ آدمی ہوں، اگر سارے کے سارے نمازی ہیں، گناہوں سے بچنے والے ہیں، متقی اور پرہیزگار ہیں تو گناہوں سے بچنا کچھ مشکل نہیں ہوتا بلکہ گناہ کرنا مشکل ہوجاتا ہے، اور اگر فاسق فاجر لوگوں کے ساتھ ہمارا سفر ہورہا ہو کہ جنھیں نہ نماز کی پروا ہے، نہ حلال وحرام کی اور نہ پاکی و ناپاکی کی تو وہاں وضو کرنا مشکل، نماز پڑھنا مشکل اور گناہوں سے بچنا بھی مشکل۔

قرآن معیارِ حق ہے

اور یہاں تقویٰ پر عمل کرنے کا معیار بتایا، وہ یہ کہ: ”وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰہِ جَمِیْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا“ یعنی ”اللہ کی رسّی کو یعنی قرآن کو مضبوطی سے تھام لو۔“ یعنی یہ بتلایا کہ اگر سب مل کر قرآن کو مضبوطی سے تھام لوگے یعنی سب مل کر اس پر عمل کروگے تو تقویٰ حاصل ہوجائے گا، کیونکہ قرآن پر عمل ہی دراصل تقویٰ ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ قرآن معیارِ حق ہے اور پھر قرآن نے جس چیز کو معیارِ حق بتایا ہے، وہ بھی معیارِ حق ہے۔ چنانچہ قرآن نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو معیارِ حق بتایا ہے، صحابہ کرامؓ کو معیارِ حق بتایا ہے، اللہ والوں کو معیارِ حق بتایا ہے۔

گویا پہلی بات یہ ہوگئی کہ قرآن مجید کو اپنا رہبر و رہنما بنایا جائے اور اس پر عمل کیا جائے، لیکن قرآن مجید کو ہم کسی معلّم کے بغیر پوری طرح

نہیں سمجھ سکتے، کیونکہ انسان کا معلّم کتاب نہیں ہوتی، بلکہ انسان ہوتا ہے۔ دُنیا کا کوئی علم وفن صرف کتاب کے مطالعے سے حاصل نہیں کیا جاسکتا۔ اللہ رَبّ العزّت نے ہر کتاب اور صحیفے کے ساتھ ایک نبی بھیجا جسے اس کتاب یا صحیفے کا معلّم بنایا گیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے قرآن مجید بھیجا گیا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو خود قرآنِ حکیم ہی نے معلّمِ قرآن قرار دیا، سورۂ آل عمران میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے مقاصدِ بعثت میں سے دو مقصد یہ بتائے گئے ہیں کہ:-

وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ.

ترجمہ:- اور آپ مؤمنین کو قرآن اور حکمت یعنی دانائی کی باتیں سکھاتے ہیں۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرائضِ منصبی میں یہ بات شامل کی گئی ہے کہ آپ قرآن مجید کے الفاظ بھی سکھائیں اور معانی بھی سکھائیں۔ یہ مضمون قرآنِ کریم میں چار سے زیادہ مقامات پر بیان کیا گیا ہے۔

کوئی کتاب کسی نبی کے بغیر نہیں آئی، البتہ ایسا ضرور ہوا ہے کہ نبی آیا ہے، کتاب نہیں آئی۔ معلوم ہوا کہ کتابُ اللہ کو سمجھنے اور اس پر عمل کرنے کے لئے معلّم کا ہونا ناگزیر ہے، قرآن کے لئے وہ معلّم تاجدارِ کونین سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، اور پھر ان کے شاگرد جنھوں نے ان سے یہ کتاب سیکھی یعنی صحابہ کرامؓ ہیں، پھر ان کے شاگرد، پھر ان کے شاگرد، یہاں تک کہ الحمدللہ یہ سلسلہ آج تک تواتر کے ساتھ چلا آرہا ہے۔

اختلاف حدود کے اندر ہو تو مذموم نہیں

آگے حکم ہے کہ ''تم اللہ کی رسّی کو مضبوطی سے تھام لو اور آپس میں پھوٹ نہ ڈالو'' یہاں خاص طور پر اس اعتبار سے توجہ کی ضرورت ہے کہ قرآن مجید نے اس جگہ ''وَلَا تَفَرَّقُوا'' (آپس میں پھوٹ نہ ڈالو) کا لفظ استعمال کیا ہے، ''وَلَا تَخْتَلِفُوا'' (اختلاف نہ کرو) کا لفظ استعمال نہیں کیا، کیونکہ اختلاف یعنی اختلافِ رائے اگر قرآن و سنت کی تعبیر و تشریح میں ہو، اِخلاص، للّٰہیت اور تقویٰ کے ساتھ ہو، اپنی بڑائی جتانے اور دُوسروں کو ذلیل کرنے کی نیت سے نہ ہو، اور اختلاف کرنے والے قرآن و سنت کی تشریح کی اہلیت رکھتے ہوں، اور ایسے مسائل میں اختلاف ہو جن میں واقعی اختلافِ رائے ہوسکتا ہے (جنھیں اصطلاح میں ''مجتہد فیہ'' مسائل کہا جاتا ہے، یعنی ایسے مسائل جن کے بارے میں قرآن و سنت نے کوئی واضح حکم نہیں دیا) تو وہ اختلاف کوئی مذموم نہیں بلکہ محمود ہے۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے درمیان بھی ایسا اختلافِ رائے رہا اور یہ اختلاف اُن معاملات میں ہوا جن کے بارے میں قرآن و حدیث کا کوئی واضح حکم موجود نہیں تھا۔

اختلافِ رائے کے نتیجے میں بعض مواقع میں صحابہ کرامؓ میں سے بعض نے ایک رائے پر عمل کیا اور دُوسرے نے دُوسری رائے پر۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاع ہوئی تو آپ نے کسی پر اعتراض نہیں فرمایا۔ اس کی

مثال یہ ہے کہ غزوۂ اَحزاب سے فارغ ہونے کے بعد جبرائیلِ امین علیہ السلام، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ: آپ نے زرہیں اُتاردیں، ہم نے تو ابھی تک نہیں اُتاریں، آپ کو اسی لمحے بنوقریظہ پر چڑھائی کرنی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فوراً صحابہ کرام کو بنوقریظہ کی طرف جانے کا حکم دیا اور فرمایا:-

لا يصلّين أحد العصر اِلّا في بني قريظة.(۱)

ترجمہ:- تم میں سے کوئی آدمی عصر کی نماز نہ پڑھے مگر بنی قریظہ میں۔

صحابہ کرامؓ روانہ ہوگئے لیکن راستے میں عصر کی نماز کا وقت ہوگیا، اب سوال یہ تھا کہ اگر عصر کی نماز بنوقریظہ میں پڑھیں تو نماز قضا ہوجائے گی یا اس کا وقت مکروہ ہوجائے گا، اور اگر یہاں پڑھیں تو بظاہر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نافرمانی ہوگی۔ صحابہ کرامؓ کی دو آراء ہوگئیں۔ کچھ صحابہ کرامؓ کا کہنا یہ تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصود یہ تھا کہ ہمیں جلدی بنوقریظہ پہنچنا چاہئے یہاں تک کہ عصر وہیں پڑھیں، گویا نماز کو قضا کرنا مقصود نہیں بلکہ جلدی پہنچنا مقصود ہے، لیکن چونکہ اب عصر کے وقت کے اندر اندر وہاں پہنچنا مشکل ہے، اس لئے ہمیں نماز یہیں پڑھ لینی چاہئے۔

دُوسرے صحابہ کرامؓ کی رائے تھی کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

---

(۱) صحيح البخاری كتاب المغازی، باب مرجع النبی صلی الله عليه وسلم من الأحزاب ومخرجه الٰی بنی قريظة.

کا حکم یہ ہے کہ عصر بنوقریظہ میں پڑھنی ہے تو قضا ہو یا ادا، ہر حال میں نماز وہیں پڑھنی چاہیے۔ چنانچہ کچھ صحابہ کرامؓ نے راستے میں نماز پڑھ لی اور کچھ نے وہاں پہنچ کر نماز ادا کی۔ بعد میں یہ واقعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے بیان کیا گیا تو آپ نے کسی فریق پر نکیر نہیں فرمائی۔[1]

اسی سے یہ بات معلوم ہوئی کہ اگر قرآن وسنت کے کسی ارشاد میں دو معنوں کا احتمال ہو اور ان میں سے کسی ایک احتمال کو اہلِ علم اجتہاد کر کے اختیار کرلیں، اور بعض دُوسرے اہلِ علم دُوسرے احتمال کو اختیار کرلیں تو ان میں سے کوئی جہت ناجائز نہیں ہوتی اور اس پر کوئی اعتراض بھی جائز نہیں۔ اختلافِ فقہاء کی حقیقت بھی یہی ہے۔

بلاشبہ اسلام ایک ہے، لیکن .....

آج اختلافِ فقہاء کو بہت اُچھالا جاتا ہے کہ اسلام تو ایک ہے پھر یہ حنفی، مالکی، شافعی اور حنبلی ہونے کا کیا مطلب؟ بلاشبہ اسلام ایک ہے، اللہ ایک ہے، قرآن ایک ہے، قبلہ ایک ہے، نبی ایک ہے، لیکن اسی ایک دین کے اندر اللہ تعالیٰ نے یہ لچک رکھی ہے کہ کچھ اَحکامات کے اندر مختلف اِمکانات اور احتمالات رکھے تاکہ ہر زمانے کے فقہاء اور مجتہدین قرآن و سنت کے دلائل پر غور کر کے مسائل کا استنباط کرسکیں اور ایسی صورت میں مجتہدین کی آراء کے درمیان اختلاف ہونا ایک ظاہری سی بات ہے، لیکن اس

(۱) حوالہ بالا۔

اختلاف کا حق انہی کو ہے جن کے اندر اجتہاد کی صلاحیت موجود ہو، قرآن و سنت کے ماہر ہوں اور زیرِ بحث مسئلے سے متعلق تمام احادیث ان کے علم میں ہوں۔

اختلاف رحمت کیسے بنتا ہے؟

ایسے لوگ جب کسی مسئلے میں اختلافِ رائے کرتے ہیں تو یہ اختلافِ رائے اُمت کے لئے رحمت بن جاتا ہے، وہ کیسے؟ اس کی مثال یوں سمجھئے کہ ایک مسئلے سے متعلق مجتہدین کے دو مختلف اقوال ہیں، اور دونوں اقوال دلائل پر مبنی ہیں لیکن قطعی دلائل کسی فقیہ کے پاس بھی نہیں۔ اب کوئی شخص مجبورکن حالات کا شکار ہوگیا تو اس زمانے کے مفتی کے لئے یہ گنجائش ہوتی ہے کہ وہ دُوسرے مجتہد کے قول پر فتویٰ دیدے۔ اس کے برعکس کسی دُوسرے ملک میں اس کے برعکس قول پر فتویٰ دینے کی شدید ضرورت پیش آئی تو وہاں کے مفتی کے لئے اس کی گنجائش ہے کہ وہ اپنے امامِ مجتہد کے قول کو چھوڑ کر اس مخالف قول پر فتویٰ دیدے۔ گویا ایک ملک میں ایک قول پر فتویٰ دیا گیا اور دُوسرے ملک میں اس کے برعکس قول کو اختیار کیا گیا، اس طرح شریعت کے اندر لچک پیدا ہوئی اور اُمت کے لئے رحمت بنی، اسی کو فرمایا گیا کہ:-

اختلاف اُمّتی رحمةٌ.

(کشف الخفاء ج:۱ ص:۶۶ رقم الحدیث:۱۵۳)

اختلاف کے باوجود تعظیم و تکریم

لیکن یہ اختلاف ہے "تفرُّق" نہیں ہے۔ صحابہ کرامؓ کے درمیان بھی اختلاف ہوا ہے، "تفرُّق" نہیں ہوا، پھوٹ نہیں پڑی۔ فقہائے کرام کے درمیان بھی اختلاف ہوا، "تفرُّق" نہیں ہوا، فرقہ بندی اور گروہ بندی نہیں ہوئی۔ چنانچہ باہمی اختلافات کے باوجود ائمہ مجتہدین ایک دُوسرے کی تعظیم و تکریم کرتے تھے اور آج بھی اِن مسالک کے پیروکار ایک دُوسرے سے بڑی تعظیم و تکریم سے ملتے ہیں۔ میں ابھی اُردُن سے آرہا ہوں، میرے سارے میزبان شافعی تھے، شام گیا تو وہاں کچھ شافعی، کچھ حنبلی اور کچھ حنفی تھے، لیکن ہماری ان سب کے ساتھ دوستیاں تھیں۔ بعض دفعہ سفر میں ایسا ہوتا کہ ظہر کے وقت ہمارے بعض ساتھی کہتے کہ ہم تو عصر کی نماز بھی ابھی پڑھ رہے ہیں (کیونکہ ان کے مسلک میں اس کی گنجائش ہے کہ حالتِ سفر میں عصر کی نماز بھی ظہر کی نماز کے بعد ظہر کے وقت میں پڑھ لی جائے)، ہم کہتے کہ ٹھیک ہے تم پڑھ لو، ہم اپنے وقت پر عصر پڑھیں گے، لیکن محبتیں اور تعظیم و تکریم برقرار رہی۔

امام شافعیؒ اور بعض دیگر فقہاء کا مذہب یہ ہے کہ جب جماعت ہو رہی ہو تو مقتدی کے لئے بھی سورۂ فاتحہ پڑھنا ضروری ہے، جبکہ امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک مقتدی کے لئے ایسی صورت میں سورۂ فاتحہ پڑھنا جائز ہی نہیں۔ یہ بہت بڑا اختلاف ہے، نماز کے متعلق جتنے اور اختلافات ہیں

وہ افضل، غیر افضل کے ہیں، لیکن یہ اختلاف وجوب اور عدمِ جواز کا ہے، اور دلائل دونوں کے پاس قوی درجے کے ہیں، قرآنِ کریم اور احادیثِ صحیحہ سے ہیں۔

امام شافعیؒ شاگرد ہیں امام محمدؒ کے، اور امام محمدؒ شاگرد ہیں امام ابوحنیفہؒ کے، امام شافعیؒ، امام ابوحنیفہؒ کے مزار پر حاضر ہوئے، وہیں نماز کا وقت ہوگیا، امام شافعیؒ کی عام عادت یہ تھی کہ وہ امامت کے لئے آگے نہیں بڑھتے تھے، لیکن یہاں جب جماعت کا وقت ہوا تو خود ہی امامت کے لئے آگے بڑھ گئے، نماز پڑھائی اور اس میں رفعِ یدین نہیں کیا، (رفعِ یدین کا اختلاف افضل اور غیر افضل کا ہے، امام شافعیؒ کے نزدیک رفعِ یدین کرنا افضل ہے، جبکہ امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک نہ کرنا افضل ہے)۔

جب نماز سے فارغ ہوئے تو کسی شاگرد نے پوچھا کہ یہ کیا بات ہے؟ آپ کی عادت تو امامت کرانے کی نہ تھی یہاں آپ خود ہی آگے بڑھ گئے اور پھر رفعِ یدین بھی نہیں کیا۔ فرمایا کہ رفعِ یدین تو اس لئے نہیں کیا کہ یہ میرے نزدیک افضل ہی تو ہے، واجب تو نہیں۔ مجھے یہاں نماز پڑھتے ہوئے شرم آئی کہ میں امام ابوحنیفہؒ کی رائے کے خلاف عمل کروں۔ اور امامت کے لئے اس لئے آگے بڑھا کہ اگر میں کسی کے پیچھے نماز پڑھتا تو مجھے سورۂ فاتحہ پڑھنا پڑھتی، کیونکہ میرے مسلک کے مطابق اس کے بغیر نماز نہیں ہوتی مگر یہاں امام صاحب کے مسلک کے خلاف عمل کرتے ہوئے شرم آئی لہٰذا میں امام بن گیا کیونکہ امام کو دونوں مذاہب کے مطابق

سورۂ فاتحہ پڑھنا ضروری ہے۔

یہ تھا اِن لوگوں کا آپس میں اکرام اور تعظیم۔ جو لوگ اِن اختلافات کو طعنہ زنی کا ذریعہ بناتے ہیں، وہ پرلے درجے کی بددیانتی سے کام لیتے ہیں یا پرلے درجے کی ناواقفیت کی بنیاد پر کہتے ہیں۔ جو حضرات اِن اختلافات کی حقیقت کو جانتے ہیں، انہیں معلوم ہے کہ یہ اختلاف محض اللہ کے لئے تھا، اس میں نفسانیت کا کوئی دخل نہیں تھا۔ بلکہ جو اختلافات فقہائے کرام کے درمیان بعد میں ہوئے ہیں، یہ صحابہ کرامؓ کے درمیان بھی موجود تھے۔ چنانچہ بعض صحابہ کرامؓ "قراءت فاتحہ خلف الامام" کرتے تھے، بعض نہیں کرتے تھے، بعض رفعِ یدین کرتے تھے، بعض نہیں کرتے تھے، بعض آمین بلند آواز سے کہتے تھے، بعض نہیں کہتے تھے۔ "نمازِ قصر" کے بارے میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا مسلک حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ سے مختلف تھا، یہ سب باتیں تھیں لیکن اس کے باوجود قرآن مجید ان کے بارے میں فرماتا ہے کہ:-

أَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ. (الفتح:۲۹)

ترجمہ:- (صحابہ کرامؓ) کافروں کے مقابلے میں سخت اور آپس میں نرم دِل ہیں۔

قرآن مجید نے یہ تمغۂ امتیاز تمام صحابہ کرامؓ کو دیا ہے کہ وہ آپس میں رحیم و کریم ہیں، معلوم ہوا کہ ان کا یہ اختلاف خالص للّٰہیت پر مبنی تھا، نفسانیت یا ضد پر مبنی نہیں تھا۔

جنگِ جمل و صفین سے متعلق اِشکال و جواب

یہاں پر کوئی سوال کرسکتا ہے کہ جنگِ جمل اور جنگِ صفین کے جو واقعات پیش آئے، وہاں ایک دُوسرے کے خلاف محاذ آرائی ہوئی ہے، یہ کیا تھا؟ یہ تفرُّق تھا یا اختلاف تھا؟ جائز تھا یا ناجائز تھا؟ نفسانیت پر مبنی تھا یا للّٰہیت کی بنیاد پر تھا؟

اس کا اُصولی جواب تو اسی آیت میں آگیا جو اَبھی بیان ہوئی، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ حضرات "رُحَمَآءُ بَیْنَھُمْ" تھے، لہٰذا معلوم ہوا کہ ان کی کوئی جنگ نفسانیت کے لئے نہ تھی، چنانچہ اس کے بہت سے دلائل بھی ہیں جنھیں تاریخ نے محفوظ رکھا ہے۔

۱:- حضرت علی رضی اللہ عنہ سے جنگِ صفین کے موقع پر پوچھا گیا کہ کل کی جنگ میں اگر ہم اپنے مخالف لشکر کے صحابہ کو قتل کریں گے تو ان کا کیا حکم ہوگا؟ فرمایا کہ وہ شہید ہوں گے۔ پوچھا گیا کہ: ہمارے لشکر کے آدمیوں کو قتل کیا گیا تو اُن کا کیا حکم ہوگا؟ فرمایا کہ: وہ بھی شہید ہوں گے۔ یہی سوال حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے بھی کیا گیا، انہوں نے بھی وہی جواب دیا جو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے دیا،[۱] کیونکہ دونوں فریق اللہ کے لئے لڑ رہے تھے، حکومت کے لئے نہیں۔

۲:- دُوسری دلیل جو تاریخ نے محفوظ رکھی ہے یہ ہے کہ: جنگِ

(۱) مقدمہ ابنِ خلدون فصل:۳۰ ص:۳۸۵۔

صفین کے زمانے میں خبر ملی کہ رُومی عیسائی بادشاہ ''قیصر'' شام پر حملہ کرنا چاہتا ہے، تو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے اُسے خط لکھا کہ[1]:-

تیرے جس ارادے کی خبر مجھے ملی ہے، اگر تو نے اس پر عمل کیا تو میں اپنے ساتھی (حضرت علیؓ) سے صلح کرلوں گا، اور ان کے سب سے اگلے دستے میں شامل ہوکر تیری طرف آؤں گا، اور بدبودار قسطنطنیہ (استنبول) کو سیاہ کوئلہ بنا کر رکھ دُوں گا، اور تجھے بادشاہت سے گاجر کی طرح اُکھاڑ کر ایسا کسان بنا ڈالوں گا جو خنزیروں کو چراتا پھرے۔

یہ شان تھی صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی۔ سچی بات یہ ہے کہ ہم صحابہ کرامؓ کو آج کل کے سیاست دانوں پر قیاس کرتے ہیں، زمین و آسمان کا فرق ہے، ہم کہاں اور صحابہ کرامؓ کہاں، قرآن مجید اور احادیث ان کے فضائل سے بھری ہوئی ہیں۔

ایک اہم اُصول

ایک بڑا اُصول یاد رکھنے کا ہے جو ہمارے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب ''مقامِ صحابہؓ'' میں تحریر فرمایا، جس کا حاصل یہ ہے کہ جب آپ تاریخی کتاب اُٹھائیں گے تو آپ کو بعض صحابہ کرامؓ مثلاً حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے بارے میں طرح طرح کی باتیں ملیں گی، حیرت

(۱) تاج العروس ج:۷ ص:۲۰۸۔ نیز ملاحظہ فرمایئے: الغریب للخطابی ج:۲ ص:۵۳۵، الفائق ج:۱ ص:۴۶، لسان العرب ج:۱ ص:۱۱۶ وص:۱۵۴۔

ہوگی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ بھلا ایسا کرسکتے ہیں! کہیں حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کے بارے میں ایسی باتیں ملیں گی، کہیں کسی اور صحابی کے بارے میں ملیں گی۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ تاریخی روایات کی سند اس قدر مضبوط نہیں ہوتی جس قدر احادیث کی مضبوط ہوتی ہے اور نہ مؤرخین ان کڑی شرائط کی پابندی کرتے ہیں جن کی پابندی محدثین کرتے ہیں۔ تاریخ کے اندر کمزور، بلکہ جھوٹے راویوں کی روایات بھی آجاتی ہیں جبکہ احادیث کے اندر کاوشیں کر کر کے دُودھ کا دُودھ اور پانی کا پانی الگ الگ کیا گیا ہے۔ اور صحابہ کرامؓ کے فضائل، ان کی بزرگی، ان کے تقدس اور ان کی عدالت کو قرآن اور احادیثِ متواترہ میں بیان کیا گیا ہے، یہی وجہ ہے کہ صحابہ کرامؓ کے تقدس کا مسئلہ عقیدے کا مسئلہ ہے۔ اور عقیدے یا تو قرآنِ کریم سے ثابت ہوتے ہیں یا احادیثِ متواترہ سے ثابت ہوتے ہیں، تاریخی روایات سے تو کیا ثابت ہوتے حدیث کی ایک قسم خبرِ واحد سے بھی ثابت نہیں ہوتے، لہٰذا صحابہ کرامؓ کی عدالت کو مجروح کرنے والی جتنی روایات تاریخ میں ہوں گی، وہ سب رَدّی کی ٹوکری میں پھینکنے کے قابل ہیں۔

اختلافِ رائے ناگزیر ہے

میرے والد ماجدؒ ایک عجیب بات فرماتے تھے، وہ یہ کہ جہاں بھی کوئی قطعی بات نہیں ہوگی بلکہ مختلف طرح کے احتمالات ہوں گے اور کئی

آدمی اس پر غور و خوض کر رہے ہوں گے تو وہاں اختلافِ رائے کا ہونا ناگزیر ہے، اختلافِ رائے نہ ہونے کی صرف دو ہی صورتیں ہوسکتی ہیں، یا تو سب کے سب بے وقوف ہوں کہ جیسا ایک نے کہا، سب نے ہاں میں ہاں ملادی، یا سب کے سب منافق ہوں کہ رائے تو کچھ اور ہے لیکن ہاں میں ہاں ملانے کے لئے اپنے دِل کی رائے پوشیدہ رکھی۔ لیکن اگر منافق بھی نہیں اور بے وقوف بھی نہیں، بلکہ سمجھ دار اور دیانت دار ہوں گے تو پھر اختلافِ رائے ضرور ہوگا۔ اور یہ صرف دینی مسائل ہی کے ساتھ خاص نہیں بلکہ ہر علم وفن کا یہی حال ہے۔ ڈاکٹروں میں اختلاف ہوتا ہے، انجینئروں میں اختلاف ہوتا ہے، قانون کی تشریح میں اعلیٰ عدالتوں کا اختلاف ہوتا ہے، ایسے اختلاف کو کہیں بُرا نہیں سمجھا جاتا، اسی طرح قرآن وسنت کی تشریح میں صحابہ کرامؓ کا اختلاف ہوا اور ائمہ مجتہدین کا بھی، لیکن یہ اختلاف ہے، ''تفرُّق'' نہیں ہے، فرقہ بندی نہیں ہے، اختلاف جائز ہے، تفرُّق یعنی پھوٹ ڈالنا جائز نہیں۔

تین چیزیں

تفرُّق پر گفتگو کرنے سے پہلے یہ ذہن میں رکھیں کہ اختلاف کے متعلق جو بات ہوئی ہے، اس کا حاصل اور لبِ لباب تین چیزیں ہیں:-

ایک یہ کہ جو اختلاف قرآن وسنت کی بنیاد پر اخلاص وللّٰہیت کے ساتھ ہو اور اختلاف کرنے والوں میں وہ اہلیت بھی موجود ہو جو اس کے

لئے ضروری ہے، تو یہ اختلاف ممنوع نہیں بلکہ اُمت کے لئے رحمت ہے۔

دُوسرے یہ کہ یہ اختلاف ایسے مسائل میں ہو جن میں قرآن وسنت نے کوئی دوٹوک فیصلہ نہیں کیا، ایسے مسائل جن میں اجتہاد کی گنجائش ہوتی ہے، یعنی ایک سے زیادہ آراء کا احتمال ہوتا ہے ان میں جو فریق بھی جو رائے دلائل کی بنیاد پر قائم کرلے وہ ناجائز اور ناپسندیدہ نہیں ہوتی۔

جب وہ ناجائز نہیں تو کسی کے لئے یہ جائز نہیں کہ دُوسرے کو اِس بنیاد پر ٹوکے مثلاً ایک شخص رفعِ یدین کر رہا ہے، دُوسرا نہیں کر رہا۔ کرنے والے کے لئے جائز نہیں کہ وہ نہ کرنے والے کو ٹوکے، اور نہ کرنے والے کے لئے بھی جائز نہیں کہ وہ کرنے والے کو ٹوکے، کیونکہ یہاں کوئی رائے بھی منکر نہیں اور غیرمنکر پر اعتراض کرنا خود منکر ہے۔

تیسری بات یہ ہے کہ ہم جو مثلاً یہ کہتے ہیں کہ ہم حنفی ہیں اور فلاں شافعی یا مالکی یا حنبلی ہے، تو اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہوتا کہ امام ابوحنیفہؒ کا قول ہی یقیناً، یقیناً صحیح ہے، اور امام شافعیؒ کا قول یا کسی اور امام مثلاً امام احمد بن حنبلؒ یا امام مالکؒ کا قول جو اس کے مقابلے میں ہے، وہ یقیناً غلط ہے، بلکہ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ہمارا قول "مظنون الصواب" اور "محتمل الخطاء" ہے، جبکہ دُوسروں کا قول "مظنون الخطاء" اور "محتمل الصواب" ہے۔ یعنی ظنِ غالب یہ ہے کہ امام ابوحنیفہؒ کا قول صحیح ہے، اگرچہ احتمال اس کے غلط ہونے کا بھی ہے، دیگر ائمہ کے بارے میں ہمارا نظریہ یہ ہے کہ ہمارا ظنِ غالب یہ ہے کہ وہ خطا ہے لیکن احتمال یہ بھی

ہے کہ وہ صحیح ہو۔

تفرُّق اور فرقہ بندی کے جواز کی کوئی صورت نہیں

دُوسری چیز ہے ''تفرُّق'' یعنی مسلمانوں میں پھوٹ ڈالنا، یہ اتنا بڑا گناہ ہے کہ شریعت نے کسی بھی حالت میں اس کی اجازت نہیں دی۔ خنزیر کا گوشت جتنا بڑا حرام ہے، مسلمانوں میں پھوٹ ڈالنا اس سے بڑا حرام ہے۔ خالص انگور کی شراب پینا جتنا بڑا گناہ ہے، مسلمانوں میں پھوٹ ڈالنا اس سے بڑا گناہ ہے۔ آپ دیکھیں گے کہ بعض انتہائی مجبورکن حالات میں شریعت نے ایک حد تک خنزیر کا گوشت کھانے اور شراب پینے کی اجازت دے دی (مثلاً ایک شخص کی بھوک یا پیاس کی وجہ سے جان جارہی ہے اور کوئی حلال چیز میسر نہیں تو اتنا خنزیر کا گوشت کھالینا یا اتنی شراب پی لینا کہ جس سے جان بچ جائے، اس کی اجازت دے دی) لیکن مسلمانوں میں پھوٹ ڈالنے کی اجازت کسی حالت میں نہیں دی۔ جتنا ہم نے قرآن و سنت میں غور کیا اور جتنا ہمارے بزرگوں نے ہمیں سکھایا، ہمیں یہی نظر آیا کہ ''تفرُّق'' اور فرقہ بندی کے جواز کی کوئی صورت جائز نہیں۔

نہی عن المنکر کب ضروری ہے؟

آج کے دور کی ایک بڑی مصیبت یہ ہے کہ باہمی اختلافِ رائے کو باہمی جنگ و جدال اور پھوٹ ڈالنے کا ذریعہ بنالیا گیا۔ شیطان کا ایک بڑا گُر یہ ہے کہ وہ عالم کے پاس عالم کے رُوپ میں آتا ہے، صوفی کے

پاس صوفی بن کر آتا ہے، اور فقیہ کے پاس فقیہ بن کر، اور اُسے یہ سمجھاتا ہے کہ دیکھو فلاں شخص نے یہ کام غلط کیا ہے اور کلمۂ حق کہنا فرضِ عین ہے، اور حدیث میں آیا ہے کہ:-

مَنْ رَّاٰی مِنْکُمْ مُّنْکَرًا فَلْیُغَیِّرْہُ بِیَدِہٖ، فَاِنْ لَّمْ یَسْتَطِعْ فَبِلِسَانِہٖ، فَاِنْ لَّمْ یَسْتَطِعْ فَبِقَلْبِہٖ، وَذٰلِکَ اَضْعَفُ الْاِیْمَانِ. (مسلم کتاب الإیمان)(۱)

ترجمہ:- تم میں سے جو شخص بھی کوئی بُرائی ہوتی دیکھے تو چاہئے کہ اُسے ہاتھ سے روکے، اگر اس کی طاقت نہ ہو تو زبان سے روکے، اور اگر اس کی بھی طاقت نہ ہو تو دِل سے بُرا سمجھے، اور یہ ایمان کا کمزور ترین درجہ ہے۔

لیکن شیطان یہ بات فراموش کرادیتا ہے کہ وہ شخص جس عمل کو روکنے جارہا ہے وہ بُرائی ہے ہی نہیں کیونکہ اس کا تعلق مجتہد فیہ مسائل سے ہے، اور شرعی دلیل کی بنیاد پر ہے، اور اگر بُرائی بھی ہو لیکن اس پر وہاں اعتراض کرنے کی وجہ سے کوئی بڑا فتنہ پیدا ہوجانے کا اندیشہ ہو تو ایسی صورت میں ''نہی عن المنکر'' بھی جائز نہیں ہوتا، بلکہ سکوت واجب ہوجاتا ہے۔ حدیث میں جو آیا ہے کہ: ''من رای منکم منکرًا فلیغیرہٗ بیدہٖ فان لم یستطع .... الخ'' یہاں پر استطاعت سے صرف حسی استطاعت اور حسی قدرت مراد نہیں بلکہ قدرت میں یہ بات بھی داخل ہے

(۱) باب کون النھی عن المنکر من الایمان .... الخ. ج:۱ ص:۵۰۔

کہ اگر اس منکر کے ازالے سے کوئی دُوسرا بڑا منکر پیدا ہونے کا اندیشہ ہے یا مسلمانوں میں پھوٹ پڑنے کا اندیشہ ہے تو یوں سمجھا جائے گا کہ قدرت حاصل نہیں اور وہاں سکوت کرنا واجب ہو جائے گا۔

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کا واقعہ

اس کی مثال صحیح مسلم میں حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کا یہ واقعہ ہے کہ ان کے دور میں مروان بن الحکم مدینہ کا گورنر تھا، اس نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ عید کی نماز میں خطبہ نماز سے پہلے دینا چاہا، حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ اور وہ اکٹھے عیدگاہ آئے تھے، حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ نے اُسے مصلےٰ کی طرف بڑھایا تاکہ سنت کے مطابق نمازِ عید پہلے ہو اور خطبہ بعد میں، لیکن وہ منبر پر چڑھ گیا، تو ایک شخص کھڑا ہوا، اس نے کوئی سخت کلامی نہیں کی، صرف ایک جملہ بولا کہ:-

الصلٰوۃ قبل الخُطبۃِ.

نماز خطبے سے پہلے ہوتی ہے۔

لیکن مروان نے کہا کہ وہ طریقہ متروک ہو چکا ہے، حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کھڑے ہو گئے اور فرمایا:-

أَمَّا ھٰذا فَقَدْ قَضٰی مَا عَلَیْہِ. (مسلم، کتاب الإیمان)

(یہ شخص جس نے یہ مسئلہ بتایا) اس نے وہ فریضہ ادا کر دیا جو اس کے ذمے تھا۔

اب یہاں غور کرنے کی بات یہ ہے کہ یہاں حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ اور اُس شخص کو یہ قدرت حاصل تھی کہ مروان کو پکڑ کر منبر سے نیچے اُتار دیتے، لیکن شرعی قدرت نہیں تھی کیونکہ اگر ایسا کرتے تو لڑائی جھگڑا پیدا ہوجاتا۔ کچھ لوگ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کا ساتھ دیتے اور کچھ مروان بن الحکم کا، جس کے نتیجے میں مسلمانوں کے اندر پھوٹ پڑتی، تو حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کے اس قول سے معلوم ہوا کہ یہاں صرف زبان سے سمجھادینا کافی تھا، ہاتھ استعمال کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ معلوم ہوا کہ منکر کا ازالہ بھی اس شرط کے ساتھ مشروط ہے کہ اس سے مسلمانوں میں پھوٹ نہ پڑے۔

عید کی نماز میں سجدۂ سہو کیوں معاف ہے؟

اس کی ایک اور مثال یہ ہے کہ شریعت کا مسئلہ ہے کہ اگر نماز میں واجب چھوٹ جائے تو سجدۂ سہو واجب ہوجاتا ہے، لیکن فقہاء نے لکھا ہے کہ اگر عید کی نماز میں واجب چھوٹ جائے تو سجدۂ سہو نہ کیا جائے۔ وجہ یہ بتاتے ہیں کہ عید کی نماز میں مجمع بہت زیادہ ہوتا ہے اور عید کی نماز کا طریقہ عام نمازوں سے کچھ مختلف بھی ہے، اس میں اگر سجدۂ سہو کیا جائے گا تو بہت سے وہ لوگ جو پوری طرح مسائل سے واقف نہیں ہوتے وہ اُلجھن کا شکار ہوجائیں گے، کوئی سجدہ کرے گا، کوئی سلام پھیرے گا، کوئی کھڑا ہوجائے گا، پھر آپس میں جھگڑا ہوگا، کچھ لوگ امام کے سر ہوجائیں گے۔ تم

نے ہماری نماز خراب کردی تو شریعت نے اُمت کو جھگڑے سے بچانے کے لئے یہ حکم دے دیا کہ یہاں سجدۂ سہو ہی نہ کرو۔

حطیم کو بیت اللہ میں کیوں شامل نہیں کیا گیا؟

اس کی ایک اور بہت واضح مثال یہ ہے کہ بیت اللہ شریف جو پوری اُمت مسلمہ کا قیامت تک کے لئے قبلہ ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ اس سے ملا ہوا کچھ حصہ "حطیم" کہلاتا ہے، یہ دراصل بیت اللہ کا حصہ تھا، لیکن جب قریش نے اس کی تعمیر کی تو ان کے پاس پیسوں کی کمی تھی، اس لئے انہوں نے کچھ حصہ چھوڑ دیا۔ جبکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی رکھی ہوئی بنیادیں حطیم کے حصے تک ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا کہ: اگر تیری قوم (یعنی مسلمان) حدیث العهد بالاسلام نہ ہوتی (یعنی اگر یہ تازہ تازہ اسلام لائے ہوئے نہ ہوتے) تو میں اس بیت اللہ کو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بنیادوں کے مطابق تعمیر کرتا، (لیکن چونکہ لوگ نئے نئے مسلمان ہوئے ہیں، اس لئے خطرہ ہے کہ اگر میں اسے منہدم کر کے حطیم والا حصہ شامل کروں گا تو نئے مسلمانوں میں کچھ لوگ بے چینی کا شکار ہوں گے جس سے مسلمانوں میں پھوٹ کا اندیشہ ہے)۔(۱)

---

(۱) بخاری، باب من ترک بعض الاختیار مخافة أن یقصر فهم بعض الناس .... الخ. رقم الحدیث:۱۲۶، مسلم، رقم الحدیث: ۱۳۳۳۔

دیکھئے! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو پھوٹ سے بچانے کے لئے بیت اللہ کو، جو قیامت تک کے لئے مسلمانوں کا قبلہ ہے، نامکمل چھوڑ دیا، اور آج تک نامکمل چلا آرہا ہے، حالانکہ یہ دُنیا بھر کے کھربوں انسانوں کا قبلہ ہے اور اس کا رُتبہ مسجد سے کہیں زیادہ ہے، لیکن مسلمانوں کو پھوٹ سے بچانے کے لئے اُسے مکمل کئے بغیر چھوڑ دیا گیا۔

مسلمانوں کی تباہی کے دو اسباب

حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ جب انگریزوں کی مالٹا جیل میں صعوبتیں اور مشقتیں برداشت کرکے رہا ہوکر واپس دیوبند تشریف لائے تو ایک مجلس، جس میں صرف علماء ہی علماء تھے، حضرتؒ نے فرمایا کہ: ہم نے اس پورے مالٹا کے قیام کے دوران دو سبق سیکھے۔ مجلس میں بڑے بڑے مشاہیر علماء موجود تھے، وہ سب چونک کر متوجہ ہوئے کہ اپنے وقت کا امام جو دو باتیں سیکھ کر آیا ہے، وہ کتنی اہم ہوں گی۔ فرمایا کہ: ہم کو دو چیزوں نے تباہ کیا ہے، ایک قرآن سے دُوری نے، اور دوسرے مسلمانوں کے باہمی افتراق نے۔ میں یہ سبق لے کر آیا ہوں کہ زندگی کے جتنے لمحات باقی ہیں، وہ قرآن مجید کی خدمت میں اور مسلمانوں کے افتراق کو ختم کرنے میں گزارنے ہیں۔ ہر بُرائی کو ایک وقت تک اور ایک حد تک برداشت کیا جاسکتا ہے لیکن مسلمانوں کے افتراق و انتشار کو کسی حالت میں برداشت نہیں کیا جاسکتا۔

دو متکبروں میں کبھی اتحاد نہیں ہوسکتا

ہمارے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ دو متکبروں میں کبھی اتحاد نہیں ہوسکتا، اتحاد کے لئے ضروری ہے کہ ایک آدمی اپنی موچھیں نیچی کرنے کے لئے تیار ہو، اگر دونوں اپنی مونچھیں اُونچی رکھیں گے تو کبھی اتحاد نہ ہوگا۔

اپنا مسلک چھوڑو نہیں، دُوسروں کا مسلک چھیڑو نہیں

کرنا کیا چاہئے؟ اس سلسلے میں حکیم الاُمت حضرت تھانویؒ کا ملفوظ جو بہت مختصر ہے، یاد رکھنے کے قابل ہے، وہ یہ کہ "اپنا مسلک چھوڑو نہیں، دُوسروں کا مسلک چھیڑو نہیں"۔ جو جس مسلک کا پیروکار ہے وہ اپنے مسلک پر عمل کرے، لیکن دُوسروں کو نہ چھیڑے۔ یہ وہی بات ہے کہ مجتہد فیہ مسائل میں کوئی جہت بُری نہیں ہوتی، اور جب بُری نہیں تو اس پر اعتراض کرنا بھی جائز نہیں۔

خلاصہ

پس میری گزارشات کا خلاصہ یہ نکلا کہ اختلاف جائز ہے، اور اختلاف کرنے والوں کی آراء کا احترام بھی لازم ہے، لیکن افتراق کسی حال میں جائز نہیں، ہم اِسی افتراق کی وجہ سے تباہ ہو رہے ہیں۔ علامہ اقبال کے کچھ اشعار اِس معاملے کی بڑی اچھی ترجمانی کرتے ہیں، انہوں نے کہا

ہے کہ:۔

منفعت ایک ہے اس قوم کی، نقصان بھی ایک
ایک ہی سب کا نبی، دین بھی ایمان بھی ایک
حرمِ پاک بھی، اللہ بھی، قرآن بھی ایک
کیا بڑی بات تھی ہوتے جو مسلمان بھی ایک
فرقہ بندی ہے کہیں، اور کہیں ذاتیں ہیں
کیا زمانے میں پنپنے کی یہی باتیں ہیں

آج کفر ہمیں مٹانے پر تلا ہوا ہے، اور ہم آپس میں جھگڑے کر رہے ہیں، ضرورت اِس بات کی ہے کہ ہر ایک اپنے اپنے مسلک پر عمل کرے اور بھائیوں کی طرح مل کر رہیں اور مل کر کفر کا مقابلہ کریں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس کی توفیق نصیب فرمائے، آمین۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین